
شمس الرحمن فاروقی

شمس الرحمٰن فاروقی

گنج سوختہ

HaSnain Sialvi

شب خون ۳۱۳، رانی منڈی الہ آباد ۳

HaSnain Sialvi

پہلی بار

ستمبر ۱۹۶۹ء

۵۰ء

ناشر: شب خون کتاب گھر الہ آباد ۳

خطاط: شب خون رقم الہ آباد

مصور: انور سجاد

مطبع: نیشنل آرٹ پرنٹرس، الہ آباد ۳

سرورق: الہ آباد پرنٹنگ ورکس، الہ آباد ۳

انتساب

غالب

یاں فلاخن بازکس کا نالۂ بے باک ہے
جادہ تا کہسار موئے چینیٔ افلاک ہے

"—*Ganji Sokhta*, name of the fifth of Khusrau's treasures; also the name of the eighteenth note of Music"

F. Steingass :*A Comprehensive Persian English Dictionary*.

"......... و معنی ترکیبی آں گنج سنجیده است، چه "سخته" و "سوخته"
بمعنی سنجیده هم آمده است۔"

(میرفشی) محمد بادشاه: فرهنگ آنندراج

HaSnain Sialvi

گنج سوختہ

HaSnain Sialvi

HaSnain Sialvi

دریں گلشن کہ رنگش ریختند از گفتگو بیدل
شنیدن ہاست دیدن ہا و دیدن ہا شنیدن ہا

——— پس ہر نقشے کہ می بینی حرفے است کہ می شنوی،

والسلام..... ؎

؎ میرزا بیدل: "چہار عنصر"

گنج سوخته

۱۹۵۹

۱۹۴۹

مناجات

(۱)

اس سے پہلے کہ
نقاب گل و گل زار میں پوشیدہ کہیں
اپنے پیوند لگے جبۂ صد رنگ میں ملبوس
مسخرہ موت کا میرے چمنستان و در و بام پہ کالک لیپے
ہانپتے جسم تھیٹر کے کھلاڑی کی طرح
ہستئ موہوم کا اک سایۂ بے وزن بنیں
صورت بے شکل بنیں ...

اس سے پہلے کہ
سمندر لب اعشوں کو ہلا کر شب مہ تاب کے ٹکڑے کر دے

*

اس سے پہلے کہ
ہزاروں مہ و خورشید کی تابش سے فزوں خیرہ کناں
موت صفت ذرۂ ناچیز کوئی
بامِ افلاک سے پھٹ کر سرِ گیتی پہ گرے
جاگتی سوتی گلابی لب و رخسار کی گڑیا کا جگر چاک کرے

اس سے پہلے
کہ یہ ہو۔ اس
سے پہلے مجھے
مرجانے کی مہلت دے دو

★

(۲)

اک آتشِ سیال سے بھر دے مجھ کو
اک جشنِ خیالی کی خبر دے مجھ کو
اے موجِ فلک میں سر اٹھانے والے!
کٹ جائے تو روشن ہو، وہ سر دے مجھ کو

دیباچہ

(۱)

ہیں زخم صدا کہ جگمگاتے ہوئے باغ
کالی لمبی ندی پہ روشن ہیں چراغ
کوندی ہے منجمد فضا میں ، دیکھو
الفاظ کی تلوار معطر بے داغ

(۲)

ہر آگ کو نذر خس و خاشاک کروں
ہر سیل کو برباد سر خاک کروں
اے شیشۂ آہنگ میں معنی کی شراب
کہہ دے ، تجھے کس درجہ میں بے باک کروں

داستان طلسم شکستہ

کے

چار راوی

(۱)

کہ پیش آمدم بر پلنگے سوار[۱]

سبز تھوہر کی جھاڑی کے نیچے
میں سنگین کانٹوں کے بستر پہ لیٹا ہوا
سیکڑوں سال تک
سرخ سورج کے چہرے پہ نظریں گڑوے
اپنے ناخن سے ارض و سما کا جگر چیرتے
اور چکراتی اونچائیوں کو ہڑپنے کا کہنہ پراسرار فن
سیکھتا اور سکھاتا رہا

۱۔ سعدی

میرے گیسو کرن، گرد، پانی، ہوا کی غذا پا کے
برگد کی سوکھی جٹا بن گئے ـــ
میرے ٹخنوں میں باہوں کی صورت حمائل ہوئے

زرد کانٹوں کی کالی نوکیلی تجسس کناں سوئیوں کو
مرے جسم میں ایسی زرخیز مٹی ملی
ان میں انکھوے لگے، ان میں کونپل ہنسی
ڈالیاں پھوٹ کر لہلہانے لگیں

★

اس طرح
میں بھی پاتال کی قوتیں اپنے اندر سمونے لگا
لذت و کرب و عرفاں کے دھارے کی
صورت امنڈنے لگا

اور جب ذرۂ ناتواں ★
حاملہ کونپلوں کی طرح بار قوت سے بوجھل ہوا

یعنی پیمانہ جب بھر گیا ——

*

تو میں اپنے نئے نشے میں چور، گویا کہ بے ہوش تھا
ایک نازک کمر، تیز چشم
جگمگاتے ہوئے دشنۂ برق کی طرح سفاک
چیتے کا رہوار لے کر
سوئے شہر عازم ہوا

*

اک شکستہ عمارت نڈھال،
سب دریچوں کی آنکھیں بصارت سے عاری
چھتیں نیم جاں
ان گنت سنگ دل ناخنوں کے کھرونچوں سے
پامال بے نور چہروں کے مانند دیوار و در
چوکھٹوں سے مکینوں کے نقش قدم مٹ گئے ہیں

*

HaSnain Sialvi

مجھے دیکھ کر یہ عمارت مری سمت میں چل پڑی ہے
مری راہ روکے کھڑی ہے!

مری بجلیاں سب پسینے کی صورت بہی جا رہی ہیں
یہ بد روح ہے یا خیالی ہیولا ہے کوئی
جو اندھے مکوڑے کی صورت گھسٹتا چلے ہے؟

میں ٹھٹکا کھڑا ہوں
اور رہوار میرا
کسی زرد پلّے کی صورت ——
—— قدم پیچھے —— دم کو دبائے کھڑا کانپتا ہے

مجھے
پائے ماندن نہیں ہے
اسے
جائے رفتن نہیں ہے

★

(۲)

بیتِ عنکبوت

یہ عورت اس لیے پیدا ہوئی ہے
کہ اس کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے پھانسی پر چڑھایا جائے
اسے یوناں کے اک مشہور ڈاکو[ف] کے بستر کی ضرورت ہے
[وہ اپنے سب شکاروں کا قد و قامت اسی بستر کے
پیمانے کی نسبت سے گھٹاتا، کاٹتا
یا کھینچ کر جبراً بڑھاتا تھا]

خطوطِ لب تو دیکھو!
کس طرح سمٹے ہوئے ہیں، سنگ دل
عامیانہ پن تراوش کر رہا ہے

ف Proorustes

یہ کینہ توز آنکھیں!
ان کی گہرائی کے کیچڑ میں
سنہری مچھلیاں غوطے لگاتی ہیں
روپہلی شاخِ طوبیٰ ہے کہ کھلتی با نہہ ہے، لیکن
کوئی سایہ نہیں پڑتا!

★

میں اپنے خول کے اندر سمٹ کر بیٹھ رہنا چاہتا ہوں
مجھے مینار کی کھڑکی سے جھک کر جھانکنے کی بھی ضرورت
کچھ نہیں ہے —

★

— مگر وہ فاحشہ زنجیرِ در کی نیند اڑائے جا رہی ہے
وہ آنکھیں خوب صورت بن گئی ہیں!

★

مجھے
خم دار زینوں سے اتر کر
نیچے آنا ہی پڑے گا...

★

(۳)

شیشۂ ساعت کا غبار

میں زندہ تھا
مگر میں تیرے سرخ، نیلگوں، سفید بلبلے میں قید تھا
ہوا وسیع تھی، مگر حدود سے رہا نہ تھی
نہ میرے پر شکستہ تھے نہ میری سانس کم
تھا بلبلے کی کائنات میں مرا ہی دم قدم
مگر مری اڑان سرخ نیلگوں سفید مقبرے کے
آخری خطوط سے سوا نہ تھی
میں حال کے اتھاہ پانیوں میں غرق
یا گزشتہ وقت کے بھنور کے دست آتشیں میں ایک صید زرد تھا

تو میں نے کیا کیا

کہ اپنی سانس روک کر کے، آنکھیں میچ کر کے، سر کو آگے کر کے، شانوں
کو جھٹک کے
ایک جست میں ہی جست کی سی سرد چھت کو توڑ کر میں اس
کے پار ہو گیا!

*

طلسم سے صدا اٹھی: "ہمیں شکست ہو گئی...
شکست ہو گئی... کست ہو گئی... است ہو گئی..
...تو گئی... او گئی... ء

*

شب برات،
آتشیں تماشوں کا سماں: اٹھا کے میری بچیوں نے ناگہاں
پچاس پیسے کے انار کے لبوں پہ ایک قطرہ ناز رکھ دی
خاک کو یہ گرم بوسہ کب نصیب تھا!

انار میں جو قید تھا، جو ذرہ ذرہ سپید تھا
وہ جن ابل پڑا
سیاہیاں سفید سرخ نیلگوں طیور سے چمک اٹھیں

*

مگر نہ جانے پھر کدھر طیور اڑ گئے
انار کو شب برات نے ندی میں دفن کر دیا

★

صدائے بازگشت
قطرہ قطرہ کنکروں کی طرح
غرق ہو گئی ـــــ

★

طلسم رہ گیا
ـــــ مگر طلسم میں جو قید تھا
وہ اس صدا کے ساتھ ساتھ
کھو گیا۔

★

یامعشر الجن والانس ان استطعتم ان تنفذوا من اقطار السمٰوٰت والارض
فانفذوا۔ لاتنفذون الا بہ سلطان۔ القرآن، ۵۵:۳۳

(۴)

ارتباط منسوخ کے مرثیہ خواں

ہم وہی ہیں
جو تیری راہوں میں
اک متاعِ غمِ جواں لے کر عہدِ پیری کو ڈھونڈنے آئے
یہ گماں تھا کہ درد کی دولت
زیست کرنے کا آسرا ہوگی
غم بڑی چیز ہے، یہ سمجھے تھے
کچھ سلیقہ ہوا تو جی لیں گے

★

تیرے رنگِ سحر کو چھوتے ہی
انگلیوں میں اک آگ جلنے لگی
تیری راتوں کی اک جھلک پا کر
روزِ روشن کی آنچ ڈھلنے لگی

لالہ زاروں کو غور سے دیکھا
خود بہ خود رنگ سے بدلنے لگے
سبز گیہوں کے زر بہ کف خوشے
روحِ ارضی میں خفتہ ذوق گنہ بن گئے
جاگ اٹھے، مچلنے لگے

★

چہرۂ کوہ پر کسی کی شبیہ
موج نے جانے کب بنائی تھی
سطحِ آبِ صبا پہ تیری شبیہ
کتنی ہی بار بن کے ٹوٹ گئی۔
چہرۂ کوہ ہے جہاں کا وہیں

★

ہر طرف چشمِ منتظر کا ہجوم، نیم وا
ٹکٹکی لگائے ہوئے
کوئی بوجھل، کوئی بخار سے سرخ
خواب کی سی تھکی تھکی آنکھیں
ہم ہی تکتے وہ، کہاں سے آئے تھے؟
ہم نے ہر جا تجھی کو ڈھونڈا تھا

★

چہرۂ کوہ پر تری صورت
موجِ دوراں نے جو بنائی تھی
وہ بھیانک شبیہ ہم سب پر
رات بھر زہر خند کرتی رہی

★

ہم،
متاعِ الم تو کیا کہیے، جو بھی لائے تھے
کھو کے بیٹھے ہیں

★

ہم وہی ہیں جو تیری راہوں میں اک متاعِ غمِ جواں لے کر
عہدِ پیری کی چاندنی کا سکوت
ڈھونڈنے آئے ....

★

گم شدہ نیش عقرب کا نوحہ

مہر سخن ثبت ہر اک دل پہ تھی
سن نہ سکا کوئی مگر ایک حرف
شور سکوت ایسا کہ مت پوچھیے
کان ہر اک ذرے کے سن ہو گئے
بن کے شرر صوت و صدا اڑ گئے ــــ!

★

کس نے سنا ــ؟
دیکھ سکا کون انھیں ــ؟
ایسی اڑان، ایسی بلندی پہ جست
نور جہاں پہنچے تو سر گھوم جائے!
کس کو پتہ ہے وہ شرر جن کی کاشت

ذروں کے خود اپنے دلوں میں ہوئی
جاگے وہ کب
کب وہ صدا بن گئے؟

★

کون تھا وہ جس کی صدا سن کے بھی
تم نے کہا —
مت کہو ہم نے سنی — تم نے کہا —
مت سنو ہم نے کہی۔

★

موت، پکارے گی تمھیں، تم سنو گے اسے، مجبور ہو تم، ہم بھی ہیں۔
غار کی گہرائیوں سے جب کبھی اٹھے گی آواز تو تم چپ
نہ رہ پاؤ گے، کوئی بھی، مگر
یک نفس سانس کو روکو گے، کہو گے کہ اب
جانے کا وقت آ ہی گیا، ہم چلے۔ ہم تو سفر
کرتے ہیں اہل جہاں۔
ہم تو چلے، خوش رہو اہل وطن۔

★

یہ تو کہو، کچھ تو کہو، وہ صدا

جس کے لئے گوش بر آواز تم سب ہی رہے، اپنی
حقیر و سفیہہ زندگیوں کے سبھی لمحات میں۔
تم سبھی حضرات و خواتین
جس کے لئے کیا کیا نہ سماعت کے رنگ گھولتے
چھلکاتے رہے عمر بھر۔ (قوس قزح سے بھی بڑی اک کماں
کھینچ کے رکھ لی تھی کہ جب آئے گی، تو اسے ہم کرلیں شکار اس طرح۔)

*

ٹھیک ہے، تم مرنے لگے، موت پر کچھ بھی نہیں تم کو ملا
اختیار

پھر بھی سنو، یہ تو کہو وہ صدا
اب وہ کہاں، تم سے کہاں
کھوگئی؟

*

سرزمین غالب

میں

چار اجنبی

(۱)

میں بھی شہید شوخیٔ حسن نمود تھا
یعنی حریف آتش پنہاں دود تھا

میں اپنے قول فعل میں آزاد تھا مگر
منت پذیر صاحب بست و کشود تھا

سرسوں کے پیلے کھیت پہ نیلا فلک کا رنگ
گویا شراب زرد تھی مینا کبود تھا

رکنے لگا تھا ذہن رواں کائی کی طرح
پتھر گرا نہ ایک تو کتنا جمود تھا

دروازۂ وجود تھا بند آئنے کی طرح
ہر حرفِ ہست خاکِ بیابانِ بود تھا

○

(۲)

عطر گیسو قاصد رنگیں نوائے خندہ ہے
عکس آئینہ رخ حیرت نمائے خندہ ہے

کشت لالہ، لعل لب کیا گوہر افشانی کریں
یک طلسم شور و ماتم جب خدائے خندہ ہے

باخبر ہوں سب چراغ انجام سے اپنے تو کیا
روشنی تو اک مریض لا دوائے خندہ ہے

سنگ و آہن کا چھنا کا یوں تو ہے حرفِ شکست
شیشے ایسے بھی ہیں جن کو یہ صدائے خندہ ہے

تازہ روئے برگِ گل گوں کا گزر گھر میں کہاں
زخمِ کہنہ وا شدن ہی اب بجائے خندہ ہے

پائے ساحل زیرِ لب ہنستی ہوئی لہروں کو گن
اک حقیقت اور بھی کچھ ماورائے خندہ ہے

○

(۳)

مسل کر پھینک دوں آنکھیں تو کچھ تنویر ہو پیدا
جو دل کا خون کر ڈالوں تو پھر تاثیر ہو پیدا

اگر دریا کا منہ دیکھوں تو تید نقش حیرت ہوں
جو صحرا گھیرے تو حلقۂ زنجیر ہو پیدا

سراسر سلسلہ پتھر کا چشم نم کے گھر میں ہے
کوئی اب خواب دیکھے بھی تو کیوں تعبیر ہو پیدا

غالب کی دو زمینوں 'تنویر ہے پیدا' اور 'گلزار ہو پیدا' کو ملا کر بنائی گئی۔

میں ان خالی مناظر کی لکیروں میں نہ الجھوں تو
خطوط جسم سے ملتی کوئی تصویر ہو پیدا

لہو میں گھل گئے جو گل، دوبارہ کھل بھی سکتے ہیں
جو میں چاہوں تو سینے پر نشان تیر ہو پیدا

○

(۴)

اک گُلِ سرخ بھی، کھنچتی ہوئی شمشیر بھی تھا
ایک ہی وقت میں وہ زہر بھی تھا شیر بھی تھا

مجھ سے صد رنگ کو دنیا نہ سمجھ پائی کہ میں
حرفِ تکفیر بھی تھا، نعرۂ تکبیر بھی تھا

سر کٹایا تو سبک سار کہا اس نے مجھے
سر جو رکھتا تھا تو ننگِ کفِ زنجیر بھی تھا

پھر بھی وہ سرحدِ احساس سے آگے نہ گیا
درد کہنے کو فلک بوس و فلک گیر بھی تھا

○

تین شاموں کی ایک شام

یہ سرمئی سی شام
رگوں میں جس کی دوڑتا ہے خوں شفق کے لالہ زار کا
کسی حسینہ کی اتاری اوڑھنی کی طرح
ملگجی سی شام
جو لمحہ لمحہ خامشی کے بند کی اسیر ہے...

یہ آسماں کی سمت منہ اٹھا کے کس کو یاد کرتی ہے؟
یہ مثلِ داغ لالۂ چمن
سیاہ آنکھوں میں جو آنسوؤں کا نور بھرتی ہے،

تو کیا اسے بھی ہے خبر کہ آنسوؤں کی روشنی
چراغ روز و شب سے شوخ تر
ہے رنگ و نور میں...؟

یہ دھیرے دھیرے اٹھ کے آسماں
پہ نشہ کی طرح سے چھائی جاتی ہے
اشارہ کرتی ہے تو
تارے روشنی کی سمت کھنچ کے آئے جاتے ہیں

سیاہیوں میں سرخیوں
سیاہیوں میں روشنی
کا یہ ہجوم دیکھنا...!

تو انگلیوں سے پاؤں کی کمر تلک
کمر سے تا بہ روئے عنبریں
نہ جانے سرد کیوں ہے شام؟

یہ تجھ سے کس نے کہہ دیا کہ دامن چمن
میں آفتاب کو
زمیں نے دفن کر دیا...؟

(۵)

آب و گیا سے بے نیاز سر دجبین کوہ پر
گرمی روے یار کا عکس بھی رائیگاں گیا

سطح پہ تازہ پھول ہیں کون سمجھ سکا یہ راز
آگ کدھر کدھر لگی شعلہ کہاں کہاں گیا

راز خرد ہو کچھ بھی اب راز جنوں تو یہ ہے بس
آنکھ تھی بے بصر رہی تیر تھا بے کماں گیا

عمر رواں کی منزلیں طول طویل مختصر
آپ بھی ہم سفر رہے غیر بھی ہم عناں گیا

○

(۶)

محفل کا نور، مرجعِ اغیار کون ہے
ہم ہیں ہلاکِ طالعِ بیدار کون ہے

ہر لمحے کی کمر پہ ہے اک محمل سکوت
لوگو بتاؤ قاتلِ گفتار کون ہے

ہم اپنے سائے سے تو بھڑک کر الگ ہوئے
دیکھا نہیں مگر پسِ دیوار کون ہے

گھر گھر کھلے ہیں ناز سے سورج مکھی کے پھول
سورج کو پھر بھی مانع دیدار کون ہے

پتھر اٹھا کے درد کا ہیرا جو توڑ دے
وہ کج کلاہ، بانکا طرح دار کون ہے

○

(۷)

ہر ہر شجر امید تھا ہر ہر شجر تھا یاس
ہر ہر شجر کے سایے میں اک شہر بن گیا

پھولا پھلا تھا وقت کے ہاتھ اور وقت ہی
صحرائے آرزو کے لئے زہر بن گیا

نم ناک روئے شام پہ گل چاندنی کا رنگ
جلنے پہ تیل سا ہی کوئی قہر بن گیا

دیوانے اتنے جمع ہوئے شہر بن گیا   جنگل کے حق میں جوشِ جنوں زہر بن گیا [فضیل جعفری]

بادل کا آسمان پہ بنتا بگڑتا روپ
یاد مزاج یار کی اک لہر بن گیا

شب کو ترا خیال سکوت نماز میں
آمین کی حکایت بالجہر بن گیا

○

(۸)

لغزشِ پائے ہوش کا حرفِ جواز لے کے ہم
خود کو سمجھنے آئے ہیں روحِ مجاز لے کے ہم

کرب کے ایک لمحے میں لاکھ برس گزر گئے
مالکِ حشر کیا کریں عمرِ دراز لے کے ہم

رات ڈھلی ہے چاند گم دور جلے ہیں دو دیے
راز تو ہے یہ کس کے پاس جائیں یہ راز لے کے ہم

دور افق پہ جا کہیں دونوں لکیریں مل گئیں
آئے تو تھے کسی کے پاس ناز و نیاز لے کے ہم

روئے سخن بدل گیا بڑھنے لگے ہیں فاصلے
آہ سکوت منجمد بیٹھے ہیں ساز لے کے ہم

خواب کی دھندلی چھاؤں میں پھیلے ہیں سائے شام کے
سجدہ کریں کہ آئے ہیں ذوق نماز لے کے ہم

رقص شرر میں کھو گئے برق کے دل سے مل گئے
لالہ و گل میں کھل گئے موت کا راز لے کے ہم

○

سنگ سوال

قلب حیات و موت سے مل نہ سکا کوئی جواب
پھینکا کیے ہیں گرچہ ہم سنگ سوال ہر طرف

اتھاہ رات کی چادر میں تم اکیلی ہو
مثال ماہ چمکتے ہیں زخم ہونٹوں کے

اندھیری رات کے دامن میں تم اکیلی ہو
ہے مثل دامن شب دامن الم میں طویل

سیاہ کوہ کے دامن میں تم اکیلی ہو
مثال خار ہے پژمردہ ابروؤں کی لکیر — مجھے بتاؤ
کہ تم کس کے انتظار میں ہو؟

★

میں اجنبی ہوں، مگر مجھ سے ڈر کے دور نہ جاؤ
تمھارے پاؤں کا پتھر میں ہی تو ہوں — دیکھو
اندھیری رات کا پہلو مرا ہی پہلو ہے —
اتھاہ رات کی چادر
مجھے ہی کہتے ہیں۔

یہ ہنستی کھیلتی لہریں
جو رک نہیں سکتیں
حقیقتاً وہ بھی میری ہی ایک صورت ہیں

★

نہ جانے کب سے کھڑی ہو
کہ پانوں اٹھتے نہیں۔
دھویں سے نیند کے کجلا گئی ہے آنکھ کی لو
یہ گورا رنگ اترنے لگا امید کے ساتھ

★

ڈرو نہیں —
مرے پاس آؤ

مجھ میں چھپ جاؤ
سیاہ کوہ کے دامن میں خود کو گم کر لو
سیاہ رات کے آگے کوئی بھی کچھ بھی نہیں
ڈرو نہیں ـــــ
مرے قدموں میں خود کو سمٹا لو

اتھاہ رات کی چادر میں تم اکیلی ہو

★

(۹)

سر پہ ہے نخلِ تمنا کے گل و خار کا تاج
سچ کہا تم نے کہ ہے عشق بڑا سادہ مزاج

کتنے تخئیل کدے آنچ سے اپنی جل اٹھے
روشنی تیز ہے پر شہر ہوا ہے تاراج

آخری قطرۂ خوں سے ہوئی جن کی تنویر
چشمِ دل مانگتی ہے اب بھی ان اشکوں کا خراج

دم بہ دم چہرہ بدلتا رہا آئینۂ درد
ہم نے یہ دیکھ کے جانا غمِ انساں کا مزاج

○

(۱۰)

چہرے کا آفتاب دکھائی نہ دے تو پھر
نیلی چھلکتی دھوپ سے آنکھوں کو بھر لیں ہم

آؤ مزاج پرسیٔ دیوار و در کریں
مدت سے ہم تھے قید اب ان کی خبر لیں ہم

چبھتی نہیں ہیں درد کی بے خواب سوئیاں
انگارے اب جگاؤ تو شاید اثر لیں ہم

سارے علوم ہم کریں فی النار والسقر
معصومیت کی راہ میں تیر و تبر لیں ہم

جی چاہتا ہے سینۂ افلاک چیر کر
طوفان ابر و باد کو مٹھی میں بھر لیں ہم

○

نیر مسعود کے لیے ایک غزل

(۱۱)

ٹوٹی کمان سرخ چلا کچھ نہ میرا بس
منظر شکست رنگ کا دیکھا کیا اور بس

ہے اتنا حبس پھر بھی زباں کھولتے ہیں ہم
اے ابر گرد سعیٔ تکلم پہ مت برس

دیوار سرد مہر کے سائے میں رات بھر
چنتا رہا میں خوف و ندامت کے خار و خس

تاریک پیچ و خم ہیں سڑک کے تھکے ہوئے
فریادِ انتظار میں رس ہے نہ کوئی حس

بازوطیورِ خواب کے شل ہیں تو کیا ہوا
کرتے ہیں جاگتے میں بھی دیوی کے ہم درس

بھوری پہاڑیوں پہ بھی سبزہ اگا کے دیکھ
دعویٰ ہے گرگہ سب پہ ہے جنگل کی دسترس

○

(۱۲)

ان کا خیال ہر طرف، ان کا جمال ہر طرف
حیرت جلوہ روبرو، دست سوال ہر طرف

مجھ سے شکستہ پا سے ہے شہر کی تیرے آبرو
چھوڑ گئے مرے قدم نقش کمال ہر طرف

ہم ہیں جواں بھی پیر بھی ہم ہیں علم بھی پست بھی
ہم ہیں اسیر حلقۂ قول محال ہر طرف

نغمہ گرا ہے بوند بوند پھر بھی اٹھی ہے کتنی گونج
اڑتی پھرے ہے ذہن میں گرد خیال ہر طرف

قلب حیات و موت سے مل نہ سکا کوئی جواب
پھینکا کئے ہیں گرچہ ہم سنگ سوال ہر طرف

اجلبنی کی موت

اکیلی جان چوپایوں کے جنگل میں بھٹکتی ہے
گھنے گنجان بالوں سے لدے جسموں پہ کالی مکھیاں
محوِ گل گشت چمن ہیں

اکیلی جان
کسی صورت سے اپنے دامن عصمت کی اجلی دودھیا چاندی سی
سرافراز پاکی کو بچائے ہے

★

صدائے دشت

رگ گل سے نازک یہ دامن
یہاں کی ہوا کو پرکھنے سے مجبور ہے
اسے پارہ پارہ ہی ہونا پڑے گا

★

قدآور سربلند اشجار...

چوپایوں
کی ٹانگوں سے پھوٹی ہیں الجھی جٹائیں
جٹاؤں سے بیچکی گھنیری لتائیں
کچل جائیں قدموں سے تو پھر جنم لیں

★

صدائے ضمیر ارض

کوئی راہ پھوٹے کوئی بات نکلے
تو دامن بچا لائیں ہم ــــ
اکیلی جان چوپایوں کے جنگل میں بھٹکتی ہے
بچالائیں ہم
چھڑالائیں ہم

کیا جائیں ہم

★

(۱۳)

پتھر کی بھوری اوٹ میں لالہ کھلا تھا کل
آج اس کو توڑ لے گئیں دو بچیاں جناب

آنکھوں میں روشنی کی جگہ تھا خدا کا نام
پاؤں تڑا کے مر رہے جاتے کہاں جناب

ہم برگ زرد سبز خلاؤں میں کھو گئے
ہم کو ہوائے سرد تھی سنگ گراں جناب

در در پھرے ہیں آپ لیے چشم تر جناب   بتلایئے ہوا بھی کسی پر اثر جناب   [حمدون عثمانی]

نیلی چمکتی دھوپ تو بکتی نہیں کہیں
ہم کس کے ہاتھ بیچ دیں لفظ دیاں حجاب

کالی زمیں پہ چھنتی دریچوں سے روشنی
باہر تو جھانکیے ہے انوکھا سماں جناب

(۱۴)

موسم سنگ و رنگ سے ربط شرار کس کو تھا
لحظہ بہ لحظہ جل گئی درد بہار کس کو تھا

سرحد آسماں کے پاس جال بچھے تھے ہر طرف
کس نے کیا ہمیں اسیر شوق شکار کس کو تھا

شمس و نجوم بے کراں ہفت فلک نبرد گاہ
روشنیوں کی دوڑ میں پائے فرار کس کو تھا

چشمِ شفق تھی خوں نشیں چہرۂ شب تھا تیغ تیز
خواب پڑے تھے تار تار صبر و قرار کس کو تھا

آج سے پہلے ہم سبھی سمجھے تھے اس کو برگِ گل
تجربۂ جلالتِ روئے نگار کس کو تھا

سایۂ ہر شجر میں تھا رینگتے لمحوں کا ہجوم
خام خیال گردشِ لیل و نہار کس کو تھا

سایۂ ابلق شجر گھات میں چشمِ نیم وا
پاؤں جہاں تھے جم گئے ہوش فرار کس کو تھا

(۱۵)

موج دریا کو پییں، کیا غم خمیازہ کریں
رگ افسردۂ صحرا میں لہو تازہ کریں

دل کے مجلس میں کریں ذات کا ماتم کب تک
آؤ باہر تو چلیں وقت کا اندازہ کریں

انگلیاں سرد ہیں پھونکیں تو انھیں ہوش میں لائیں
اپنے سینوں پہ لکھیں حرف وفا تازہ کریں

خوں ہے اک دولت دل لوٹ ہی لیں اہل فلک
چہرۂ داغ قمر پہ تو نیا غازہ کریں

شیشہ تھا اک غم دل ٹوٹ کے ساحل پہ گرا
منتشر ریت کے ہر ذرے کا شیرازہ کریں

گرگ احساس سے بچنے کی تو کوئی نہیں راہ
سگ تخئیل پہ بند آنکھ کا دروازہ کریں

○

(۱)

اسرار کے دریاؤں کا پانی ہے یہ رات
مردار سمندر کی روانی ہے یہ رات
بچپن کی سنی کوئی کہانی ہے یہ رات
خوش بو سے بھری رات کی رانی ہے یہ رات

(۲)

تا حد نظر دھوپ کا صحرا دیکھوں
اور اس پہ تری آنکھ کا سایا دیکھوں
جب آنکھ کھلی تھی تو نہ دیکھا کچھ بھی
اب بند ہے جو آنکھ تو کیا کیا دیکھوں

اسرار

سفید کاسنی نبوئی[1] سرخ
سینہ تانے سر اٹھائے
جگمگا رہی تھی لَو ، مسکرا رہی تھی لو

نہ جانے کون ڈس گیا کہ تلملا اٹھا چراغ
چراغ کے موکلوں نے دودھیا دھویں سے جھانک کر
دکھائے دانت ۔۔؟
کون ڈر گیا ؟
کسے ڈرا دیا ؟
کسے بھگا دیا ۔؟

*

سفید جھلملاتے موتیوں سے دانت
ننھی منی سیپیوں کے ہار کی طرح

---

[1] نیبو (لیموں) کے رنگ، یعنی شوخ زرد رنگ کی۔

بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی منی
پھول توڑتی ہوئی
گلابی بنفشی فراک ـــ ہوا کے دوش پر وہ
کاسنی ڈوپٹہ اڑ رہا ہے ہر طرف
چھن چھنا کے ٹوٹتی بکھرتی وہ ہنسی کی چوڑیاں

مگر یہ کیا ہوا؟
وہ کھیل کھیل میں ہی رو پڑی ہے کیوں؟
کون اسے رلا گیا؟
کون اسے ڈرا گیا؟

★

سر سر وہ سرسراتی ڈولتی ہوائے تند
غبار و خس اڑائے جا رہی تھی شام سے 'وہ اونچے اونچے پیڑ
ان کی پتیاں ـــ مقابلہ ہوا کے جوش کا جو کر نہ پائیں' نیچے آ رہیں
گلاب و خس کے درمیاں نہ فرق کچھ بھی رہ گیا ـــ مگر
یہ کیا ہوا؟ یہ دفعتہً ہوا ٹھہر گئی ہے کیوں؟
نہ جانے کس نے اس کو ناف ارض میں سلا دیا!
کون اسے ـــ کون اسے ڈرا گیا؟

★

(۱۶)

عزیز تھا، لیکن پر غرورِ سر تو نہ تھا
حقیر تھا، پھر بھی خاکِ رہ گذر تو نہ تھا

یہ بات الگ، ماتھے پر عرق کی بوندیں ہیں
مرا گذر تجھ تک ایسا پر خطر تو نہ تھا

کتنی روشنی خنجر کی نہاں کردں ہیں مگر
نگاہ کا تیغہ حرفِ معتبر تو نہ تھا

تو جسم تھا آہٹ پا کے میری سنگ ہوا
مگر مرا مرنا تجھ پہ منحصر تو نہ تھا

(۱۷)

ہر جلوۂ حسن بے وطن ہے
شاید کہ یہ محفل سخن ہے

ہر ساز کی آرزو تکلم
ہر ساز سکوت پیرہن ہے

اے باد سموم ابھی سے مت چھیڑ
نکھرا ہوا صبح کا بدن ہے

اک وجد میں جسم و جانِ فن کار
ہے رقص کہ روح کا بدن ہے[لہ]

ہر فکر مثالِ چہرہ روشن
ہر شعر میں بوئے پیرہن ہے

کافور کی شمعیں جل اٹھی ہیں
ابلاغ خیال کا کفن ہے

○

لہ ......O brightening glance
How can we know the dancer from the dance ?
—Yeats

(۱۸)

رندوں کو ترے آرزوے خشک لبی ہے
اب اے نگہ مست تو کیا ڈھونڈ رہی ہے

منسوخ ہے اس دور میں ہر رسم گریباں
اب مشغلۂ اہل جنوں سینہ زنی ہے

شہزادۂ معنی کوئی آئے تو جگائے
شاعر کا تخیل بھی تو خوابیدہ پڑی ہے

مدت سے تھی آوارہ وہ پہنائے فضا میں[1]
خاک رہ انجم جو مرے سر پہ پڑی ہے

ہر خار ہے غلطیدہ بہ خوں دشت وفا میں
اے سنگ رہ یار کسے ٹھیس لگی ہے

○

[1] مدت سے تم آوارہ ہو پہنائے فضا میں [اقبال]

(۱۹)

آس رہی اب نہ یاس خوف نہیں کچھ
دل سے اٹھا جاں کا پاس خوف نہیں کچھ

شہر اجڑنے لگے ہیں گاؤں کا رخ کر
گرگ نہ ہو بدحواس خوف نہیں کچھ

ہم سبھی اس باد گرد میں عریاں ہیں
چندر بدن خوش لباس خوف نہیں کچھ

چار طرف خواہشات، غیر ہوا، لوگ
کیا سب ہے التباس خوف نہیں کچھ

اب وہ نہیں رہ گئی ہے چھوئی موئی
قاہر سورج ہے راس خوف نہیں کچھ

چہرے پہ ستر حجاب ڈال کے گھومو
لوگ نہیں حق شناس خوف نہیں کچھ

خلوت و جلوت میں پڑھ یہ مصرع انشا
"کوئی نہیں، آس پاس خوف نہیں کچھ"

○

ماہ منیر

خلاؤں کے اندھے مسافر سے پوچھیں —
وہ اک ذرۂ خاک سے ٹوٹ کر دور لا انتہا وسعتوں اور
بے سمت راہوں کی پر ہول خاموشیوں میں
بھٹکتا پھرا تھا۔
ہواؤں کے رہوار پر برق رفتار صدیاں گزرتی رہیں
اس کی راہوں میں پل بھر کو آہٹ نہ آئی ...
زمیں، آتشیں گوے چوگاں، خلا میں لڑھکتی ہوئی
یوں ہی بے مدعا رقص کرتی ہوئی
بطن خورشید سے آگ کے سرخ دھبے کی صورت نکل کر
خلا کے اندھیرے سمندر میں ڈوبی ...
پھر آہستہ آہستہ تاریک ہونے لگی تھی کہ اندھا مسافر
اچھل کر کسی سمت بے نام کو چل دیا تھا۔
پھر اب تک الگ ان کے محور، الگ ان کی راہیں

زمیں بھی اندھیری،
مسافر بھی بے نور

لیکن اسے کیا پتا تھا کہ اک دن زمیں
ساری گہرائیاں پاٹ کر آ ملے گی

*

تو افلاک کے اندھے رہ رو سے پوچھیں
کہ یہ لمحۂ وصل، کہہ
تجھ کو کیسا لگا ہے ___ ؟

(۲۰)

دیکھیے بے بدنی کون کہے گا قاتل ہے
سایہ آسا جو بپھرے اس کو پکڑنا مشکل ہے

رگ ہر لفظ سے رستے ہوئے خوں سے گھبرا کر
میں جو خاموش رہا سب نے کہا تو جاہل ہے

تجربہ دل میں رہے تو کھلے آنسو بن کر
اور کاغذ پہ چھلک جائے تو شمع محفل ہے

جو بھری دنیا کی سنگین عجائب نگری میں
اپنا سر آپ نہ پھوڑے وہ جہنم واصل ہے

لب دریا کو ملانے کا طریقہ کیا ہوگا
دونوں جھکتے ہیں مگر بیچ میں دریا حائل ہے

○

(۲۱)

سرخ، سیدھا، سخت، نیلا، دور، اونچا آسماں
زرد سورج کا وطن، تاریک بہتا آسماں

سرد، چپ، کالی سڑک کو روندتے پھرتے چراغ
داغ داغ اپنی ردا میں سر کو ڈھکتا آسماں

جانے کب سے بے نشاں وہ چاہِ شب میں غرق تھا
میں جو اٹھا ہو گیا اک دم اجالا آسماں

دور دور اُترتا گیا ہیں نور کے رہوار پر
پھر بھی جب بھی سر اٹھایا منہ پہ دیکھا آسماں

ناچتا پھرتا شرر بھی نیم شب کی گود میں
دل لگی کا اک جتن تھا، کچھ تو کھلتا آسماں

○

(۲۲)

کنار بحر سے دیکھوں گا موج آب میں سانپ
یہ وقت وہ ہے دکھائی دے ہر حباب میں سانپ

وہ کون تھا، مرا ہم زاد تو نہ تھا، کل رات
جب اس کے نام کو پوچھا کہا جواب میں سانپ

اسے مظاہرِ ہستی سے سخت الفت تھی
ملا وہ شخص چھپائے ہوئے نقاب میں سانپ

گزشتہ رات مجھے پڑھتے وقت وہم ہوا
ورق پہ حرف نہیں ہیں یہ ہیں کتاب میں سانپ

یہ ڈھلتی رات، یہ کمرے میں گونجتا صحرا
اُڈتا خوف ہے دل میں کہ پیچ و تاب میں سانپ

تمام جلوۂ وحدت ہے شام ہو کہ سحر
ہے جس حساب میں صحرا اسی حساب میں سانپ

○

خام سوزیم و نارسیدہ تمام

نسیم خلد بے خوفی سے میرے گھر میں در آئی
کہا میں نے کہ تم کب شعلۂ جوالہ بن جاؤگی،
خاشاک دل و جاں کو جلا کر خاک کرنا ہے
بدن پر کپکپی طاری ہے، دیواریں لرزتی ہیں
وہ ٹھنڈک ہے کہ بالوں کی جڑوں میں خون جمتا جا رہا ہے۔
ہر کڑی چھت کی
سکڑ کر چشم افیوں نوش کی مانند چھوٹی ہوتی جاتی ہے۔
وہ دیکھو! وہ رہی اک گربۂ مسکیں، چھپی
کونے میں بیٹھی ہے، اب ان تکتی ہوئی آنکھوں کے بھوئے ملگجے بادل
گل و لالہ، شرر، برسا نہیں پاتے
سیہ بلی اندھیرے گھر میں چھپتی پھر رہی ہے۔
وہ ٹھنڈک ہے کہ قلب ہوش یخ بستہ ہوا جاتا ہے، تم کب

شعلۂ جوالہ بننے والی ہو

بولو ــــــ؟

نسیم خلد بوئی ــــــ مرے تارِ نفس میں یوں
نہاں سفاک لالی ہے
لہو جیسے رگِ نازک میں پوشیدہ، مجھے آغوش میں
بھر کر نچوڑو تم
تو انگارے ٹپکتے دیکھ پاؤ گے ــ مجھے
مٹھی میں بھر کر منہ میں رکھ لو۔ پی کے دیکھو۔ وہ
سنہرا تیر ہوں میں جو گلے میں چبھ کے بن جاتا ہے
انگارا ــــ تمہیں
جلنا نہیں آتا۔

*

(۲۳)

دل ہر قطرہ ٹھہرنے سے گریزاں ہے اب
خون اظہار کی حدت تن عریاں میں نہیں

پٹریاں دھوپ کی رستوں پہ بچھی ہیں ہر سو
کوئی پرچھائیں مگر قریۂ ویراں میں نہیں

میں نے خود زہر ندامت میں بجھائی ہیں رگیں
ورنہ کیا درد ہے جو حیطۂ درماں میں نہیں

ہر طرف سر بہ فلک سرخ بگولوں کے ستوں
بازدید شب سے اب حد امکاں میں نہیں

یہ الگ بات دکھائی نہ دے کچھ بھی لیکن
کس سیہ آنکھ کا چرچا شب کوراں میں نہیں

○

(۲۴)

بے حسی میں جیتے ہیں کچھ سزا ہی مل جائے
کتنا سونا جنگل ہے بھیڑیا ہی مل جائے

تو جو اک جہنم ہے، اپنی لو میں پھنکتی ہے
کاش اس جہنم کا راستا ہی مل جائے

غول اک بیابانی میرے ساتھ چلتا ہے
اس میں کب میں ضم ہوں گا یہ پتا ہی مل جائے

یہ ہوا ہے کتنی تیز، آنکھیں چپ ہیں تنہا ہوں
سر بریدہ شمعوں کا طائفہ ہی مل جائے

○

(۲۵)

دن بھر کی دوڑ رات کے اوہام وسوسے
ٹھنڈی سلونی شام کی خوش بوئیں ڈھل گئے

رقص نسیم موت تھا ہر چند مختصر
دریا کے منہ پہ پھر بھی اچھل آئے آبلے

کردار قتل کرنے لگے لوگ یوں کہ ہم
اپنے ہی گھر میں بیٹھ کے آوارہ بن گئے

نازک ہے مثل ماہ مگر سرمئی بدن
اے جاں تجھے یہ کس نے دیے غسل آگ کے

○

(۲۹)

سخت فضا ہے گاڑھی ہوا ہے جا نہ سکو گے اوپر تم
موم سے کاندھوں پر چپکاؤ کتنے ہی چاہے شہپر تم

سر کو جھکائے الگ تھلگ کیوں بیٹھے ہو آؤ کھیلیں کھیل
روح ہم اس میں پھونکیں گے کوئی تراشو پیکر تم

بھورے فلک کا سر ہو ٹکڑے برق کی ایسی چوٹ پڑے
ساتھ ہمارے رہنا سیکھو ایسے بھی دیکھو منظر تم

نیلے پانی کی حیرانی کس نے دیکھی کون کہے
سامنے رکھ کر آئینہ یوں تو گم سم بیٹھے اکثر تم

برف کے گالے سے ہلکے ہم اپنی قیمت کیا مانگیں
شمع سخن پر پگھلا دو یا جو بھی سمجھو بہتر تم

ناخن کی اک ہلکی جنبش کاغذ خالی چاک جگر
اب یہ ضرورت کیا ہے کسی کے دل میں آتارو خنجر تم

اونچی اونچی چٹانوں کا بوجھ اٹھائے پھرتے ہیں
لطف سخن پڑھنے والو بات کو سمجھو پتھر تم

○

(۲۷)

یوں سخت بہت دکھائی دیتا ہے
ٹوٹے تو پتہ چلے کہ شیشہ ہے

یہ سوچ تو لو کہ اپنے آگے اب
ٹھہری ہوئی بادلی کہ دریا ہے

وحشی آنکھوں کی دھوم ہے گھر گھر
پتھر کا شہر کسی نے دیکھا ہے

ساحل صورت صدا سمندر، سب
سوکھے ہوئے دست و پا کا صحرا ہے

جھپٹتی چلی آ رہی ہے دیکھو تو
بستی ہے شکار، شام چیتا ہے

مرمر کی چٹانیں سینہ تانے ہیں
ہاتھوں میں مگر ندی کے تیشہ ہے

○

آرفیوس، ۱۹۵۹

نشیب دردسے فرازِ درد سے گزر چکا
جواب بھی تم نہ مل سکو تو زندگی سے فائدہ؟

مری اسی ادھیڑ بن میں آدھی راہ کٹ گئی
کہ شاخِ درد گر شگوفۂ طرب نہ دے سکی

تو کون روز و شب کی بے گیا زمیں سجائے گا؟
شفق کا رنگ جو پہن سکے ہے کس کا حوصلہ؟

حیات کا یہ بے پناہ سیل رک سکا کہیں؟
لہو کسی کا بہہ گیا کسی کی جھک گئی جبیں

شبِ سیہ سے بھی سیاہ تر ہے میرا آسماں
اسی ردائے تار میں ہیں گم مرے زمیں زماں

دلوں کی آگ بجھ گئی تو کیا سحر ہوئی نہیں؟
اتر رہا ہے مشرقی افق پہ تختِ آتشیں

مگر کبھی تو روز و شب کے شور و غل کے درمیاں
کبھی کہیں بہ زیر سایۂ سکوت بے کراں

مرا فریب شوق میرے ذہن کو اچھال کر
زماں مکاں کی قید و بند سے مجھے نکال کر

اڑا چلے ہے پھر مجھے نہ جانے کدھر جہاں
سفید جھلملاتی خواب سی بسی ہیں بستیاں

گل رمیدہ رنگ درد رونق حیات ہے
جہان آرزو میں اور جو ہے بے ثبات ہے

جو لمحے کرب و غم کے تھے وہ پھول بن کے کھل گئے
دھنک کے سات رنگ اک نئی کرن میں مل گئے

وہ ارتکاز شوق ہے کہ دھوپ میں بھی رات ہے
چمک وہ درد میں کہ مانند شعلۂ ممات ہے

شعاع مہر تم سے میری روح میں اتر گئی
رگ حیات میں گلوں کی تازگی بکھر گئی

شکست آرزو کا غم نہیں کہ آرزو تو کی
شراب لب سے کم نہیں وہ نشۂ الم سہی

رخ حیات سرخ ہے چمن چمن سنور گئی
گھر گرے، کلی کھلی، جدھر جدھر نظر گئی

★

نگارِ ہجر کے جھلستے بوسوں کی قسم مجھے
جو تم نہیں تو زندگی ہے خونِ چشمِ نم مجھے
کوئی ہجوم بے خیال پھول سب کچل گیا
ہنسی خوشی سہی کسی بھی طرح دل تو جل گیا
یہ کیسا دشت ہے جہاں قرار ہی ہے رم مجھے
جواب روز و شب نہیں، ہو کیوں قبولِ غم مجھے

★

مگر سفر یہ کاروانِ انتظار و غم کا تم کو پا کے ختم کب ہوا؟
غبار اٹھا موت کا کہ راہ کھو گئی نشان منزلوں کا مٹ گیا
یہ نفس پیمبرِ اجل فسونِ خواب پڑھ کے پھونک دے اگر کہیں
کشاں کشاں فنا کے آستان تار پر جھکائے میری روح کی جبیں
تو پھر یہ زخمِ غم کرم ستم کی سب کہانیاں میں بھول تو نہ جاؤں گا؟
یہ چبھن یہ نیش انتظار کی سہوں گا کب تلک جو یاد بھی میں رکھ سکا
کہیں نہ ہو پھر اس طرح کہ انتظار ہی میں بیت جائیں لاکھوں ماہ و سال
فنا کے دھندلے دیس میں نہ کھو ہی جاؤ تم تمہیں ہو ایسا راہ کا ملال

وہ اژدہام رہ رواں موت ہو کہ کوئی کچھ نہ دیکھ یا سمجھ سکے
دماغ ہو نہ آنکھ ہو بس ایک سایہ جیسے خود ادھر سے اُڑا ادھر چلے

نہ ایسا ہو کہیں وہاں بھی ہو یہاں کی طرح اختیار و جبر کا سوال
نسیم جبر اس طرح چلے کہ پارہ پارہ ہو تمھارا شیشۂ خیال

محیط مرگ کی سیاہ خشمگین موج کا کنارہ گر کوئی نہ ہو؟
یہ سنتے پڑھتے آئے ہیں ہے موت اک نیا سفر، اگر سفر کوئی نہ ہو؟
یہ گھٹ بھنور، یہ لہر چیختی چمکتی سر بسر ہے ایک لمحے کی ہی بات گر؟
یہ موت ہو کہ زندگی گر اس کے بعد ہے سکوت پردۂ حیات پر؟
جہان کہنہ کے سوا ہو زندگی کا خاتمہ زماں اگر کوئی نہ ہو؟
دیار مرگ سرحد خیال تک ہو ریگ زار سر بسر کوئی نہ ہو؟

★

میں اس تصور ہلاکت آفریں سے زرد ہوں
تڑپ اٹھا ہے یوں خیال ذرہ ذرہ درد ہوں

میں زندگی کہوں اسے تو موت پھر کسے کہوں
جو پا سکوں تو موت ہے یہ موت گر نہ پا سکوں

ہے اک وجود بے بدن میں اس کے ہم نبرد ہوں
لہو کا رنگ سبز ہے میں قطرہ قطرہ سرد ہوں
★

من عرف نفسہٗ...

روشنی کی ایک ننھی سی لکیر
میرے کمرے کے اندھیرے کا بدن
چپکے چپکے ٹٹولتی ہے
جس طرح حبشی حسینہ کے ڈھلے
صندل کے سے
آبنوسی جسم کے اعصاب میں
تیز سوئی کی اچانک اک چبھن
سرسراتے سانپ کی مانند دوڑاتی ہے خوں
جھن جھنا اٹھتے ہیں سارے تار و پو

★

اور پھر آہستہ آہستہ کہیں
زیرِ سطحِ جان و دل
یہ تلاطم
رک کے سو جاتا ہے
یعنی
اژدرِ آسودہ خاطر کی طرح
خواب نوشیں کے اڑاتا ہے مزے

*

پھر بھی لیکن
اک غبارِ انتظار
میرے کمرے کی فضا میں
مثلِ آبِ سیاہ روشن ہے

جیسے تاریکی خود اپنی تہ تک
پہنچنے کو بے چین ہو

اس لیے

روشنی کی اس انگشت بے رحم کا

خیر مقدم کرے

اژدرِ آسودہ خاطر کو جگائے

*

درد یہ ہے

میرے کرے کا اندھیرا کبھی اک بار مسخر نہیں ہو پاتا

نقش تاریک منور نہیں ہونے پاتا

کوئی گوشہ

کبھی روشن،

کہیں گوشہ کوئی :

ابلے کیڑوں کی قطاروں سے لٹکتے ہوئے انجیر کے خوشے،

راکھ کے ڈھیر،

غلاظت کے کنویں،

سونے چاندی کے دمکتے ہوئے پھل۔

*

روشنی!

یا، تیز سوئی!

یا، تلاطم!

جو بھی ہو تم،

تیرگی کو اس طرح سے منقسم

تم جو کردیتے کہ دیواروں کا رنگ

صاف کھل اٹھتا تو اپنے کو بھی ان میں منعکس میں دیکھ لیتا۔

*

حرف آخر

اب جب کہ آپ نے جوں توں کرکے اشعار کی یہ کتاب ختم کر ڈالی ہے تو آیئے نثر میں کچھ لوگوں کا شکریہ ادا کر لیا جائے، کیوں کہ ان کے بغیر یہ کتاب آپ تک نہ پہنچتی۔

انور سجاد کا، جنھوں نے بے انتہا مصروفیت کے باوجود انتہائی خوب صورت سرورق بنایا۔

محمود ہاشمی اور شہریار کا، جو مجھے شاعر سمجھنے پر مصر ہیں، اور میں جن کی رائے کو اس معاملے کے علاوہ ہر معاملے میں سند سمجھنے پر مصر ہوں۔

ظفر اقبال کا، جن کے رنگ کلام سے میں اتنا متاثر ہوں کہ بھول کر بھی ان کی طرح کا شعر نہیں کہا۔

نیر مسعود کا، جنھوں نے سارے کلام کا انتخاب، ترتیب اور تزئین اپنے ذمے لے کر میری مشکل آسان کر دی۔

افتخار جالب کا، جن کی شاعری مجھ سے مختلف ہے لیکن خیالات مجھ جیسے ہیں۔

محبوب الرحمٰن کا، جن کی وجہ سے اس مجموعے کی ضخامت میں کچھ اضافہ ہوا۔

جمیلہ کا، جو میرے اشعار کے الفاظ بھول جاتی ہیں لیکن آہنگ یاد رکھتی ہیں اور آہنگ ہی کو معنی سمجھتی ہیں۔

افشاں اور باراں کا، جنھیں میرے اشعار کے معنی نہیں معلوم، لیکن میں نے انھیں ان کے سامنے اتنی بار پڑھا ہے کہ بہت سے اشعار انھیں یاد ہو گئے ہیں۔

اور آپ کا، جن کے وجود کے یقین نے اس کتاب کو جنم دیا۔ بدھ چانچ سے کسی نے کہا تھا: "تمھارے شعر دنیا میں بہ مشکل دو آدمیوں کو محظوظ کر سکتے ہیں۔" اس نے جواب دیا: "میں انھیں دو کے لئے لکھتا ہوں۔"

شمس الرحمٰن فاروقی

الہ آباد، ۱۲ جولائی ۱۹۶۹